بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہ محرم الحرام کا عشرۂ گریہ و ماتم گذر گیا!

آؤ، اب سوچیں کہ معاملہ کیا تھا؟ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم شیعہ ہو کہ سنی، صرف مسلم کی حیثیت سے غور کرو۔ بہت سے واقعات درد انگیز بھی ہوتے ہیں، لیکن اگر ان میں دینی اور انسانی اہمیت ہو تو وہ تفکر بھی چاہتے ہیں۔ جذبات کا ریلا اگر تند و تیز ہو تو سوچنے کی قوتیں پوری طرح کام نہیں کرتیں، اور سوچنے میں کمی رہ جائے تو کتنے ہی امورِ مہمہ میں رسمیت زور پکڑ لیتی ہے اور معنویت گم ہو جاتی ہے۔ بڑے واقعات صرف ماضی کی حکایات نہیں ہوتے، بلکہ وہ حال کے لیے بھی سبق ہوتے ہیں۔ پس غمِ حسینؓ آنکھوں سے ٹپک جانے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ تو رگ و پے میں سرایت کر جانے اور کرداروں کی رُوح بن جانے کے لیے ہے۔

امام حسینؓ کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے کسی مفاد کے لیے نہیں بلکہ صلاحِ اُمت اور فلاحِ انسانیت کے لیے زندگی کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر جب اعلائے کلمۃ الحق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے تو اپنی جان کے ساتھ اپنے قبیلے اور اپنے رفیقوں کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ ایک راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے دَور کے اس حوصلہ شکن منظر کو دیکھ کر ماتم کے لیے بیٹھ جاتے کہ عجمی بادشاہت نے دینِ حق کے نظامِ خلافت کو منہدم کر کے اپنا تخت بچھا لیا ہے یا وہ رندانہ ثقافت کے غلبے کے دکھ میں آنسو بہاتے رہتے۔ امام کا مقام اس لیے بلند ہوا کہ عزم و ہمت کی راہ پر گامزن ہوئے اور اس قوت کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کا مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا۔ جو شورائی نظام کے بجائے فردِ واحد کی حکمرانی، موروثی طرزِ حکومت، کتاب و سنت سے آزاد فرماں روائی، دولت و سطوت کے مظاہرے

عیش و طرب کے ہنگامے اور فنونِ رندانہ کی سرگرمیاں ساتھ لے کے آئی تھی۔ امام کا مسلک شیون و ماتم کے بجائے سلطانِ جائر کے سامنے شاہدِ حق بن کے کھڑے ہونے کا تھا جس کا مرحلۂ تکمیل شہادت ہے۔

امام کی مظلومانہ شہادت پر جس قدر غم ہوتا ہے اس سے بڑھ کر فخر محسوس ہوتا ہے کہ ملّت اسلامیہ کی اس پُرنور شخصیت نے تاریخ میں ایک عظیم مثال قائم کی۔ بلکہ ساری انسانیت کے لیے روشنی کا مینار کھڑا کر دیا۔

اُمّت کا ہر فرد حق کا نقیب اور شاہد علی الناس ہے جو دعوتِ دین سے کام کا آغاز کرتا ہے، شہادتِ حق دیتے ہوئے عمر گذارتا ہے، قدم قدم پر کشمکش و جہاد کے مراحل سے گذرتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ شہادت کے اس تکمیلی مقام کو بھی پالیتا ہے، جسے تسلیم جاں کہتے ہیں۔ ہماری تاریخ شہداء کی تاریخ ہے، دعوتِ حق اور شہادتِ حق کی تاریخ ہے اور حق کی خاطر جانوں کی نذر اللہ کے سامنے پیش کرنے والوں کی تاریخ ہے۔ یہ تو سارا گھرانا ہی اہلِ شہادت کا گھرانہ ہے۔

؎ کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

جب شہادت کی داستان چھڑتی ہے تو پہلے تو امام حسینؓ کے ساتھ ساتھ مجھے سیدنا عمرؓ کی یاد بھی آتی ہے۔ (جن کی شہادت سے ماہِ محرم کا آغاز ہوتا ہے) ۔ پھر سیدنا عثمانؓ کی مظلومی کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ پھر سیدنا علیؓ کے بہتے ہوئے آخری قطرہ ہائے خون بھی نگاہوں میں جھلملاتے ہیں۔ پھر تاریخ میری انگلی تھام کر حضرت سمیہؓ کی میت کے سامنے لے جاتی ہے۔ کبھی وہ سیّد حمزہؓ اور جعفر طیارؓ کی شانِ قربانی دکھاتی ہے۔ کبھی وہ مجھے مصعبؓ بن عمیرؓ جیسے مکہ کے بانکے نوجوان کی لاش دکھاتی ہے جسے ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا موجود نہیں تھا چنانچہ پیروں کی طرف گھاس ڈالی جاتی ہے۔ میرے حافظے کی نگاہوں کے سامنے ذوالبجادینؓ کو رات کی تاریکی میں لحد میں اتارا جا رہا ہے۔ میں مدینے کے ستر معلّمین و قاریان کے تعلیمی قافلے کو مخالف سازشیوں کی چالبازی کا شکار ہوتے دیکھتا ہوں۔ پھر وہ سولی گویا میرے دماغ میں نصب ہے جس پر حضرت خُبیبؓ کو مکہ والوں نے لٹکایا تھا اور دوسری

طرف زید بن دثنہؓ کو مقامِ تنعیم میں آخری سانسیں لیتا دیکھتا ہوں۔ اُدھر ایرانی گورنر فروہ کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں حکومت پھانسی دیتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ بن حنبل پر برسنے والے کوڑوں کی سزا آج بھی گوشِ دل سے سنائی دیتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ پابندیٔ حق کی وجہ سے بندی خانوں کی صعوبتیں بھگتتے ہیں۔

یہ سلسلہ چھڑا تو میری نگاہ اپنے قریب کی تاریخ پر بھی جاتی ہے۔ آخر میں سید احمدؒ شہید، شاہ اسمٰعیلؒ شہید، تحریک مجاہدین کے ہزاروں شہدائے معرکہ آرا اور شہدائے سزا یافتگان کو کیسے بھول جاؤں؟ بے شمار فلسطینیوں کے خون کی سرخی کیسے آنکھوں سے اُوجھل ہو جائے؟ عدنان مندریس کی سزائے موت کو کیسے فراموش کر دیا جائے؟ امام حسن البنا اور سید قطب شہید اور اُن کے ساتھیوں کی جان سپاریوں کو حساب سے کیسے خارج کر دیا جائے؟ وسط ایشیا کے وہ مسلمان جو اشتراکی بہیمہ دستیوں کا شکار ہوئے، وہ جنھوں نے ایرانی بادشاہت کے خلاف قربانیاں دیں، اور وہ جو آج افغانستان میں اشتراکی سامراج کے تسلط سے بچنے کے لیے خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ختم ہو رہے۔ پھر وہ جو اریٹیریا میں، یوگنڈا میں، جنوبی فلپائن میں مسلمان ہونے کی قیمت کے طور پر اپنا لہو اور اپنی ہڈیاں دے رہے ہیں، مزید وہ بے بس مسلمان جو کمبوچیا، ویت نام، تھائی لینڈ اور برما کے علاوہ خود بھارت میں مسلسل زندگیوں کا خراج پیش کر رہے ہیں، کیا محفلِ شہادت میں ان لاکھوں افراد کا کوئی مقام نہیں۔

یہ سب امام حسینؓ کے ساتھی ہیں۔ مختلف شہیدوں کی کربلائیں الگ الگ ہیں، اُن کے کوفے جدا جدا ہیں، اُن کے شمر مختلف ہیں، مگر یہ سب کے سب ایک ہی شمعِ ایمان پر جل مرنے والے پروانے ہیں۔ حسینؓ ان سب کے ہیں، اور یہ سب حسینؓ کے ہیں۔

ہم جو زندہ ہیں، ہمیں بھی جاننا چاہیے کہ جدید تہذیب کی بنائی ہوئی کربلا میں کھڑے ہیں ـــ مادیت پرستانہ وحشت کا بڑا ہولناک صحرا ہمارے گرد پھیلا ہوا ہے۔ اس صحرا میں نت نئے انقلابی حادثوں کے جھلسا دینے والے بگولے اُٹھتے ہیں۔ اس میں محرومیوں کے کانٹے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں جور و ریائے

فرات بہتا ہے۔ اس کا پانی پینے سے پیاس اور بھڑکتی ہے۔ اور اس صحرا میں مادیت کے لشکروں میں گھرے ہوئے ہر شخص کی خودی اور شخصیت آہستہ آہستہ ذبح ہوتی رہتی ہے۔

خود مسلمانوں کی دنیا میں دیکھو تو کہیں موروثی بادشاہت کا جبر ہے اور کہیں آمرانہ تسلط کا جور، کہیں اسلامی حکومتیں ہیں مگر خدا اور رسولؐ کے عطا کردہ حقوق کی غصب اور قوانین شریعت کے تقاضوں سے بے نیاز۔ کہیں کوئی اچھا حکمران آ بھی جائے تو انتظامی مشینری کے کارپرداز سیکولر اور اشتراکی ذہن کے ہیں۔ اور احکام نافذ کرنے والے عمال فرعونی مزاج کے۔ کہیں محنت زیادہ اور حاصل کم — کہیں ایک طرف عیش و تنعم اور دوسری طرف فقر و فاقہ — پھر کیچر کے نام پر وہی میخانہ ہائے طرب اور رقص خانہ ہائے شبانہ۔

مگر ہماری شانِ خود مستی یہ ہے کہ ہماری ساری دلچسپیاں آمدنیاں بڑھانے کے لیے وقف ہیں۔ دولت اب ایک ضرورت سے آگے نکل کر باقاعدہ بت بن گئی ہے۔ ہم سارے اعلیٰ مقاصد کو بھول بھلا کر معیارِ زندگی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کر کے نوکریاں اور کاروبار کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں سکون حاصل کرتے ہیں، ریڈیو سے معلومات لیتے ہیں۔ ٹیلی وژن سے تفریح حاصل کرتے ہیں۔ وی سی آر حاصل کر کے بلیو فلموں تک کا مزہ لیتے ہیں۔ سردیوں میں گرم کمروں میں اور گرمیوں میں سرد کار مشینوں کے سایے میں ہم نہ جانے کس جہاد میں مشغول ہیں اور کونسا انقلاب لانا ہمارے مدنظر ہے؟ معلوم نہیں، کس کربلا کا رخ ہے؟ کونسی قوت کو چیلنج کرنے کے عزائم ہیں؟

ہم جو مسلمان ہیں — سنی ہوں یا شیعہ — کبھی ہم نے یہ بھی سوچا ہے کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ کبھی یہ سوچا کہ ہم دوسروں کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کرتے ہیں؟ کبھی سوچا کہ ہم کماتے کس طرح ہیں؟ اور خرچ کس طرح کرتے ہیں؟ کبھی یہ سوچا کہ ہمارے مشاغل کیا ہیں؟ کبھی حساب لگایا کہ ہمارے معاشرے میں خیانت کاری کتنی ہے؟ کبھی اندازہ کیا کہ حرام خوری کا تناسب کتنا ہے؟ وہ ہمارے ہی بھائی ہیں جن سے ملک کے جیل بھرے پڑے ہیں۔ وہ ہمارے ہی ساتھی ہیں جو قتل کر کے پھانسی لگتے ہیں اور عمر قیدیں بھگتتے ہیں۔ اور بہت سے قانون کی گرفت سے بچ بھی نکلتے

ہیں۔ وہ ہمارے ہی ماحول کے پروردہ ہیں جو چوری اور جیب تراشی کرتے ہیں۔ ہمارے ہی قومی قافلے کے ہمسفر ہیں جو زنا، جوئے، اسمگلنگ اور سود سے ملوث ہیں۔ وہ ہمارے ہی ہم دم، ہم قوم ہیں، جو نمازوں کے تارک، روزہ خور اور زکوٰۃ چور ہیں۔ ہمارے ہاں وہ ادب پیدا ہوتا ہے جس میں خدا اور مذہب کا مذاق اُڑا کر لطافت پیدا کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی فلمیں، ٹیلی وژن پروگرام، اخبارات کے صفحات اور اشتہارات کے ڈیزائن تیار ہوتے ہیں، جن میں نسائیت کے عنصر کو ادا کو سامانِ کاروبار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارا مجموعی کردار اس مقصد کے اُلٹ نشوونما پا رہا ہے جس کے لیے شہیدِ کربلا نے قربانی دی تھی۔

آخر جس مسلمان کو یہی معلوم نہ ہو کہ مسلمان کیا ہوتا ہے؟ وہ حسینؓ کو کیا سمجھے گا اور شہادتِ حسینؓ سے کیا سبق لے گا۔

مَیں جب اپنا یہ اجتماعی حال زار دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کبھی ہمیں اپنی پسپائیوں کے ماتم کا بھی جلوس نکالنا چاہیے اور اپنی خودشناسی کے دکھ پر بھی مجالسِ عزا منعقد کرنی چاہئیں۔ مگر پھر فوراً ہی مجھے میرا ایمان و شعور اس خیال سے روک دیتا ہے۔ معاشروں کی اصلاح ماتموں سے نہیں ہوتی، قوموں کی تعمیر عزاداریوں سے نہیں ہوتی۔ بدی کی قوتوں کو آنسوؤں سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ اس کام کے لیے تو ویسا ہی عزم، ویسا ہی جذبۂ اقدام، ویسا ہی ولولۂ قولِ حق اور ویسا ہی ذوقِ شہادت درکار ہے جس کا مظاہرہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے کیا۔

اُمتِ مصطفوی کا بھلا تو صرف اس میں ہے کہ علیؓ و حسینؓ سے سبق لینے والے بھی اور ابوبکرؓ و عمرؓ سے مثال لینے والے بھی شہدا علی الناس بن کے اُٹھیں، صداقت و دیانت کو عام کریں، رزقِ حرام کا ایک ذرہ قبول کرنے پر فاقہ کو ترجیح دیں۔ اور اسلامی معاشرے میں عجمی بادشاہت و جبریت کے ساتھ ملحدانہ مادیت کی افادہ پرستی اور اس کے پیدا کردہ کلچر کی بادہ ارزانیوں اور رقاصاؤں کی عریانیوں کو اسی طرح مسترد کریں جیسے حضرت امام حسینؓ نے ان کو مسترد کیا تھا۔ اور خانوادۂ حسینؓ کی عفت مآب بیبیوں نے اُسے نگاہِ حقارت کا مستحق سمجھا تھا۔

کوئی عالم ہو یا عامی — سنی ہو یا شیعہ — ایک فرقے سے منسوب ہو یا دوسرے سے موسوم — دین کی ماہیت و حقیقت سب کے لیے ایک ہے۔ دین کی اساسی دعوت پر جمع ہو کر سب کو شہدا علی الناس بن کے اُٹھنا چاہیے۔ سب کو شہداء علی الناس ہونا چاہیے۔ ہر برائی، ہر خرابی، ہر فتنہ، ہر ظلم، ہر استحصال کے خلاف — خواہ وہ اُوپر سے آئے یا نیچے سے اُبھرے — اگر حساس مسلمان مل کر کام کریں تو ہمارا معاشرہ بے شمار گندگیوں سے پاک ہو سکتا ہے، جنھوں نے زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ہم لوگ اگر اپنا فرض ادا کریں تو کوئی بعید نہیں کہ اپنے اردگرد کی تپتی کربلا سے کامیاب ہو کر نکل جائیں۔

کوئی ایسا محرم بھی آنا چاہیے کہ امام شہید سے محبت رکھنے والا ہر فرد اپنی زندگی بدل کر امام کے اسلامی مشن کے لیے سرگرم عمل ہونے کا عہد کرے۔ پھر ہر آنسو کی قدر و قیمت ہے جو پلکوں پہ جھلملانے لگتا ہے، اور اُس سے بڑھ کر قیمت اُس صبر کی ہے، جو درد کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا بلکہ انسانی کردار کے رگ و پے میں جاری و ساری کر دیتا ہے۔

---

(۲)

اللہ نے ہمیں اقبال کیا دیا، بہت بڑی قوت عطا کر دی، ایسی قوت جو ہمارے ذہن و کردار کو تا دیر متحرک رکھے گی۔

ابھی ابھی یومِ اقبال گذرا ہے، فضا میں اس کی لمعانیاں باقی ہیں۔ جگہ جگہ چھوٹی بڑی مجالس میں اقبال کے کام اور مقام کے متعلق مضامین پڑھے گئے۔ بعض چیزیں رسائل و اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔

پاکستان کے وجود کا تعلق دو حوالوں سے اقبال سے متعلق ہے۔ ایک اس حوالے سے کہ برصغیر میں اقبال نے ایک جداگانہ مسلم مملکت کے لیے پیغام دیا تھا۔ دوسرے اس حوالے سے کہ اقبال نے پاکستان میں عالمِ قرآنی یا نظامِ اسلامی کے قیام کا جذبہ ہمیں ودیعت کیا۔ اور آج جو تحریک احیائے اسلام ۳۴ برس سے یہاں نشوونما پا رہی ہے اس کے لیے جہاں ایک مضبوط تاریخی پس منظر موجود تھا، وہاں اقبال نے اس کے لیے فکر و احساس کی فضا تیار کی۔

اقبال کی شاعری جذباتی اور خواہشاتی انداز کی شاعری نہیں ہے۔ وہ اگر تلذذ کے راستے پر بڑھتا تو

کبھی ایک بڑا شاعر نہ ہوتا ۔ جسم کے گرد طواف کرنے والا کوئی جنسیت زدہ شاعر، یا رندانہ اور لاأبالیانہ سطح سے آگے نہ جاسکنے والا ادیب، یا محض ذاتی جذبات واحساسات اور بکھرے ہوئے افکار کا قیدی فن کار کوئی اونچا مقام نہیں پاسکتا ۔ اقبال کی خصوصیات یہ ہیں کہ:۔

۱ ۔ وہ یقین کا شاعر ہے ۔ یعنی حیات و کائنات اور خدا و انسان کے متعلق اُس کے ہاں ایک مضبوط فکر پائی جاتی ہے ۔ یہ فکر شروع ہی سے موجود تھی، مگر پہلے دھندلی تھی، پھر واضح ہوتی گئی ۔ اُس نے منفی طرزِ فکر سے آغاز ہی نہیں کیا ۔ البتہ اُس کا مثبت طرزِ فکر مسلسل نکھرتا گیا، مضبوط ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جسے ایمان کہتے ہیں ۔

۲ ۔ وہ کشمکش کا شاعر ہے ۔ اُس کی کشمکش وقت کے جامد مذہبی و معاشرتی ماحول کے خلاف بھی تھی، انگریزی غلامی کے خلاف بھی، ہندو اکثریت کے بڑھتے ہوئے سیاسی و اقتصادی تسلّط کے خلاف بھی ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغرب کی لادین مادہ پرستانہ تہذیب کے خلاف بھی ۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ جس قومی پسپائی کا آغاز میسور اور پلاسی میں جنگی شکست سے ہوا تھا اور جس کی تکمیل تحریک مجاہدین اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی بظاہر ناکامی سے ہوئی، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے برطانوی اقتدار اور مغربی علوم وافکار اور مادہ پرستانہ تہذیب و معاشرت کے سامنے خم کھا جانے کی پالیسی اختیار کر لی ۔ یہاں تک کہ جب سرکاری تعلیم اور نوکریوں اور ممبریوں کی دوڑ میں اقبال کی قوم، خصوصاً اس کے پیش رَو طبقے شرح صدر کے ساتھ شریک ہوگئے تو اقبال نے اپنا نغمہ الاپا جو پہلے بانگ درا تھا، آگے چل کر بالکل ضربِ کلیم ہی بن گیا ۔ یہاں پہنچ کر تو اقبال اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں پاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے نوائے چنگ طلب نہ کرو ۔

مادہ پرستانہ تہذیب کے پورے نظام افکار کو وہ اپنے جہانِ شعر میں چھان پھٹک کر دکھاتا ہے ۔ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اور آمریت وفسطائیت اور کمیونزم وسوشلزم سب کو شعور کی کسوٹی پر کھوٹا دکھا دیتا ہے ۔ وہ اس تہذیب کی فکری و سیاسی شخصیتوں اور کرداروں کی جانچ کرتا ہے ۔

حیرت ہوتی ہے کہ غلامستانِ برصغیر میں پرورش یافتہ اور دیارِ مغرب کے مراکزِ علم سے جام بھرنے والا یہ نوجوان کہاں سے اپنے لیے وہ شخصیت لایا کہ جس نے اُسے مغرب زدگی اور فرنگ پرستی کے سیلِ ہلاکت کے سامنے اسلامی حکمت کے موقف پر استوار کر دیا ۔

ماحول اور خصوصاً اغیار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر کرشمہ ہائے فن دکھانے والوں کے قد بڑے نہیں ہوسکتے۔ بلند بامی صرف اُس کو نصیب ہوتی ہے جو ماحول کی پستیوں اور اغیار کی خودی کش بلندیوں، دونوں کے خلاف معرکہ آرا ہوتے ہیں۔

۳ --- اقبال وقت کے ناخوشگوار سیاسی احوال کے مقابلے میں اپنا اصل زورِ فکر و نوا مغرب کی عالمگیر تہذیب دوں نہاد کے خلاف صرف کرتا ہے۔ کیونکہ سیاسی احوال تو بدلتے رہتے ہیں، البتہ ایک تہذیب اپنے ساتھ جو فکری سیلاب لارہی تھی وہ آسانی سے رکنے والا نہ تھا اور اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان و شعور کی قوتوں کی ضرورت تھی۔ اقبال نے اپنے نوجوانوں میں ان قوتوں کو اُبھارنے کی کوشش کی۔

۴ --- اُس نے صرف منفی ردِّعمل کا شاعر بننا پسند نہیں کیا، بلکہ لادین تہذیب کے مقابلے پر اُس نے اسلامی تہذیب کے عناصر و مظاہر اور اُس کی اعتقادی و فکری رُوح کو اپنے فن سے اُبھارنے کے لیے کاوشیں کیں۔ یہی مثبت انداز اقبال کی عظمت کا باعث بنا۔ اگر وہ محض گریہ و ماتم کی راہ اختیار کرتا تو تان مایوسی پہ ٹوٹتی۔ منفیت کے بل پر کوئی موثر تحریک بپا نہیں ہوتی۔ حزن و یاس کے جذبات کبھی سرمایۂ انقلاب نہیں بن سکے۔

۵ --- اسلامی تہذیب کا راگ شاعری کے ساز پر الاپنے کے لیے اُسے بنا بنایا اسلوب نہیں ملا، چند متفرق جزئی تجربے تھے، مگر خدا پرستانہ تہذیب کو پیش کرنے اور اس انقلابی حرکت کا ذریعہ بنانے کے لیے اقبال نے اپنا اسلوب خود ایجاد کیا اور بہت سا وقت صرف کر کے اُسے نشوونما دی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ وہی دینی حقائق جن کا مذاق اُڑا کر ادب و شعر کی رونق کا سامان کیا جاتا تھا، اچھی خاصی صراحت سے اقبال نے بیان کیے، مگر نہ فن مجروح ہوا، نہ شعریت میں کوئی کمی آئی۔ بلکہ خواص و عوام، علما و صوفیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے ہر حلقے کے لیے اقبال کے کلام میں کشش بڑھتی گئی۔

ان وجوہ سے اقبال اُس بلندی پر پہنچا کہ آج اقبال کی شاعری کے دورِ آغاز کو اسّی سال اور اُس کی وفات کو ساڑھے تینتالیس سال گزر چکے ہیں، مگر اب تک کوئی شاعر سر اُبھار نہیں سکا۔ بلکہ بعض خاصے اچھے درجے کے معروف شاعر دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنوں کے نہاں خانوں کی محفلوں سے بھی ایسے اُٹھے کہ آج دماغ پر زور دیے بغیر اُن کی یاد تک نہیں آتی۔ ادھر کئی زندہ

اور بظاہر بھاری بھرکم شاعر ایسے ہیں جو طبقاتی اور سماجی لحاظ سے بہت اہل رسوخ ہیں اور بڑے بڑے حاشیہ برداروں کی فوج کی فوج اُن کے ناموں کے کتبے اُٹھائے پھرتی ہے، مگر کسی طرح بات نہیں بنتی۔

اس مرتبے کے اقبال کے کیے ہوئے کام نے حالات پر ایک اثر یہ ڈالا کہ پاکستان کی تشکیل کا راستہ بنا، اور دوسرا اثر اس کا یہ نمایاں ہے کہ اس وقت پاکستان میں (اور پاکستان سے باہر بھی) احیائے اسلام کی تحریکیں نمودار ہو کر نشوونما پا رہی ہیں۔ یعنی اقبال آج اپنے شعری مجموعوں اور محققین کی کتابوں، مقالوں اور رسائل تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ سیلِ تاریخ کی ہر موج کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسے کہتے ہیں حیاتِ دوام!

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

ادارہ